امریکا کا سامراجی کردار اور اُمت مسلمہ

عبدالرشید صدیقی°

بلاشبہہ یہ ایک حقیقت ہے کہ متحدہ ریاست ہاے امریکا ایک سامراجی مملکت ہے۔ سوویت یونین کے سقوط کے بعد جب کمیونسٹ بلاک منتشر ہوگیا تو پھر امریکا تاریخ کا سب سے زیادہ بااثر ملک بن گیا جس کا دبدبہ تمام عالم پر چھا گیا۔ اس کے فوجی اڈے دُنیا کے ۱۴۰ ممالک پر محیط ہیں۔ ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء (نائن الیون) کے حادثے سے پہلے بھی امریکی فوج ۷۰ ممالک میں مستقلاً اپنے اڈے قائم کیے ہوئے تھی۔ نائن الیون کے حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور اپنے مفروضہ خدشات کی بنا پر اس نے اپنی فوجی قوت کو دگنا کر دیا۔ اس کی عسکری طاقت کا اندازہ صرف اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس کی افواج اور ملٹری اخراجات کا بجٹ دیگر بڑی بڑی طاقتوں کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ ہے۔ ظاہر ہے یہ اس کے دفاع اور ملک کی حفاظت سے کہیں زیادہ ہے۔

امریکا نے اس بہانے، کہ وہ دنیا میں امن اور جمہوریت کو فروغ دینا چاہتا ہے، ان وسائل کے حصول کو سندِ جواز بخشی ہے اور اس زبردست قوت کو مجتمع کیا ہے۔ حالانکہ اگر حقائق پر نظر رکھی جائے تو پچھلے ۵۰ برسوں میں امریکا کئی وسیع پیمانے پر ہونے والی جنگوں میں ملوث رہا ہے۔ یہ جنگیں کوریا، ویت نام، کمبوڈیا، لاؤس، صومالیہ، عراق (دو مرتبہ) اور افغانستان میں ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت ساری مختصر فوجی کارروائیاں کیوبا، پاناما اور سربیا میں بھی کی گئی ہیں۔ مزید فوجی انقلاب (coup) جو ایران، گوئٹے مالا، برازیل، انڈونیشیا، نکاراگوا اور چلّی میں برپا ہوئے ان میں امریکا کی پشت پناہی شامل رہی۔ اس پر مستزاد یہ کہ جو عوامی تحریکات یونان، فلپائن اور دیگر

° سیکرٹری، اسلامک فاؤنڈیشن، لسٹر، انگلستان

جنوبی امریکا کے متعدد ممالک میں ہوئیں ان کو ناکام بنانے اور دبانے میں امریکا کا ہاتھ رہا ہے۔ فرڈینڈ ماؤنٹ ایک برطانوی مبصر کا تجزیہ ہے کہ ۱۶۸ مختلف فوجی اقدامات میں امریکی افواج کا دخل رہا ہے۔ ان جنگوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کئی ملین کے قریب ہے۔ اس طرح یہ سامراجی قوت نہایت سفاک اور بدطینت ہے، بمقابلہ ان قوتوں کے جو پہلے گزر چکی ہیں۔ اس بات کی تائید رچرڈ فالک (Richard Falk) نے اپنی کتاب Choose and Counter Revolution: After the Arab Spring (انقلاب کا انتخاب اور مقابلہ کیجیے، عرب بہار کے بعد) جو اس سال شائع ہوئی، میں کی ہے۔ انھوں نے 'بہارِ عرب' کے حوالے سے جو تجزیہ پیش کیا ہے اس میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے:

> امریکا کی نہایت اہم حکمت عملی اس خطے کے لیے عام طور پر یہی رہی ہے کہ وہ ظالمانہ اور آمرانہ حکومتوں کی پشت پناہی کرے تاوقتیکہ وہاں کی قیادت مغرب کے ساتھ دوستانہ رہے۔ اگر حکومت کے بارے میں یہ تاثر ہو کہ وہ مخالفانہ رویہ رکھتی ہے یا اپنی مملکت کو قابو میں نہیں رکھ سکتی تو اس صورتِ حال میں وہ امریکی فوجی مداخلت کا نشانہ بن جاتی ہے، تاکہ اس کے بجائے کوئی اور دوستانہ، فرماں بردار اور بااثر قیادت کو اقتدار حاصل ہو جائے۔ (ص۱۴)

فوجی کارروائیوں کے علاوہ بھی امریکی استعماری قوت کا مظاہرہ اس کی عالمی، تجارتی اور مالیاتی سرگرمیوں سے ہوتا ہے، جسے coca-colonization کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ امریکی تجارتی ادارے اپنے مشروبات اور مصنوعات دنیا بھر میں رائج کر کے اپنے کلچر اور ثقافت کو خوب فروغ دے رہے ہیں۔ ہندستانی نژاد راہول مہاجن اپنی کتاب The New Crusede: American War on Terrorism (نئی صلیبی جنگ: امریکا کی دہشت گردی کے خلاف جنگ) میں لکھتے ہیں:

> ترقی یافتہ ممالک کے تجارتی اداروں کو پس ماندہ ممالک کے تجارتی اداروں کے مقابلے میں بہت زیادہ فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ یا تو وہ ان کو ضم کر لیتے ہیں یا بالکل تباہ کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے امریکا کے آزادانہ تجارتی معاہدات اصلاً پس ماندہ ممالک

کی آزادانہ پالیسی کے لیے پیغامِ موت ہے۔ نئے عالمی نظم (New World Order)
کو بروے کار لانے اور ان ممالک میں اپنا کنٹرول قائم کرنے کے لیے آئی ایم ایف
(عالمی مالیاتی فنڈ)، عالمی بنک، عالمی تجارتی ادارہ جو بظاہر بین الاقوامی ادارے ہیں
لیکن حقیقتاً یہ سب امریکا کے کنٹرول میں ہیں، اس کے آلۂ کار ہیں۔ (ص۱۰۲-۱۰۳)

متحدہ ریاست ہاے امریکا اب ایک نئی سامراجی قوت ہے اور اس کی فوجی قوت کے علاوہ چونکہ آئی ایم ایف اور عالمی بنک بھی اس کے دائرۂ اقتدار میں ہیں، اس لیے اس نے ترقی پذیر ممالک کو قرض کے پھندوں میں جکڑ رکھا ہے۔ ان ممالک کو ان بین الاقوامی اداروں کی عائد کردہ پابندیوں کو مجبوراً قبول کرنا ہوتا ہے تاکہ ان کو قرض مل سکے۔ انھیں اپنی برآمدات کو بڑھانے کی خاطر اپنے مزدوروں کی تنخواہوں کو کم کرنا پڑتا ہے۔ وہ بین الاقوامی کمپنیوں کو اپنے ملکوں میں تجارت کرنے کی سہولتیں دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مقامی کمپنیاں ان سے مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ اس طرح آزادیِ تجارت کے بہانے امریکا اور اس کے تجارتی ادارے بین الاقوامی تجارت پر پوری طرح حاوی ہیں۔ آئی ایم ایف، عالمی بنک اور WTO کی بدولت امریکا کا تسلط ترقی پذیر ممالک پر قائم ہے۔ بظاہر یہ ممالک آزاد اور خودمختار ہیں لیکن حقیقتاً سب امریکا کی غلامی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ امریکی قوت اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ ان ممالک میں آمرانہ اور کٹھ پتلی حکمران برسرِ اقتدار رہیں تاکہ وہ اپنے آقا کے احکامات کو نافذ کرسکیں۔ انھیں حقوقِ انسانی اور معاشرے کی فلاح و بہبود کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہوتی اور وہ لوگ جو امریکا کی پالیسیوں سے انحراف کا راستہ اختیار کرنے کی جرأت کرتے ہیں ان کو دست بردار کردیا جاتا ہے اور ان کے بجاے اپنے فرماں بردار لوگوں کو مسلط کردیا جاتا ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ سب ڈراما حقوقِ انسانی اور جمہوریت کے نام پر رچایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس صورتِ حال کو حقوقِ انسانی کا امپریلزم کہتے ہیں، جو حقوقِ انسانی کی اصطلاح کی توہین ہے اور ناقابلِ قبول تصور ہے۔

عسکری، سیاسی، تجارتی اور مالیاتی ہتھکنڈوں کے ساتھ میڈیا کی قوت ہے جسے سامراجی مقاصد کے لیے بے دریغ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اب اس نئی سامراجیت کا اصل ہدف اُمت مسلمہ ہے اور خاص طور پر اسلامی تحریکات جو امریکا کے عالمی تسلط

کے منصوبے میں مزاحم سمجھی جاتی ہیں۔ مغربی مفکرین برملا یہ کہہ رہے ہیں کہ احیاے اسلام کے لیے کوشاں جماعتیں ان کے لیے خطرے کا باعث ہیں۔ فرانسس فوکویاما جو مشہور امریکی دانش ور ہے، اپنے ایک مضمون 'اصلی دشمن' (The Real Enemy) میں، جو نیوزویک کے دسمبر ۲۰۰۱ء کی خاص اشاعت میں شائع ہوا تھا، ۲۰۰۲ء کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسلامی انقلاب پسند کسی طرح بھی اختلافات کو برداشت نہیں کریں گے۔ یہ لوگ ہمارے دور کے فاشسٹ ہیں اور ہمیں ان کے خلاف جنگ کرنا ہوگی۔ اس کا پیغام بالکل واضح ہے۔ اگر مسلمان مغرب کے ساتھ اپنے تعلقات برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو وہ اسلامی آئیڈیالوجی ترک کر دیں کیونکہ یہ نہ صرف مذہبی رسومات تک محدود ہے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں پر، چاہے وہ سماجی ہوں، سیاسی ہوں یا ثقافتی، حاوی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ جنگ جو ہمارے ایمان اور طرزِ حیات پر مسلط کی جارہی ہے اس کے مقابلے کے لیے حکمت عملی کیا ہے؟ ایک نہایت آسان سا راستہ تو یہی ہے کہ ہم یہ سب من وعن قبول کرلیں جو ہم پر تھوپا جا رہا ہے۔ یہ رویہ تو ہمارے بہت سے لیڈر جو مغرب کی طاقت سے بے حد مرعوب ہیں، قبول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان میں اتنی حکمت نہیں ہے کہ وہ یہ چیلنج قبول کریں لیکن ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ سچائی کی راہ پر چلنا کبھی بھی آسان نہیں ہوتا۔ یہ راہ مشکلات سے گھری ہوئی ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس پر چلنے والے کم ہی ہوتے ہیں، لیکن بدی کا راستہ کشادہ اور آسان ہوتا ہے اور اس پر چلنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ نشیب کی طرف پھسلنا آسان ہوتا ہے لیکن اُونچائی پر چڑھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عقبہ (دشوار گزار گھاٹی) سے سورۃ البلد میں موسوم کیا ہے اور فرمایا: وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ○ (البلد ۹۰:۱۰-۱۱) ''ہم نے دونوں نمایاں راستے دکھا دیے ہیں مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی''۔

قرآن میں انبیا علیہم السلام کے متعدد واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت کم لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول کیا لیکن وہ بددل نہیں ہوئے بلکہ اپنے مشن پر مسلسل گام زن رہے۔ انھوں نے مصالحت کی آسان راہ نہیں اختیار کی۔ یہی وہ راہ ہے جو ہمیں اختیار کرنی ہے۔ ایک مرتبہ پُریقین ہوکر اگر ہم نے اپنے آپ کو اس کام پر لگا دیا ہے تو پھر کوئی پس وپیش کا

سوال ہی نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں مستقل مزاجی سے تمام مشکلات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

درپیش چیلنج اور حکمت عملی

اس صورتِ حال میں مسلمان حکومتوں کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ایک اہم موضوع ہے جس پر مفصل گفتگو کی ضرورت ہے۔ فی الوقت صرف اُمت مسلمہ کی اور بالخصوص وہ مسلمان جو مغرب میں آباد ہیں ان کی ذمہ داریوں کی نشان دہی مقصود ہے۔ کیوں کہ ان کا سابقہ وہاں کی مقامی آبادی سے رہتا ہے اور ان کی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کو وہاں عوام تک اس طرح پہنچائیں کہ وہ اسلام کے بارے میں ان بدگمانیوں کو دُور کرسکیں تاکہ خوف کی فضا (Islamphobia)، جو بنائی جارہی ہے، وہ دُور ہوسکے۔ خاص طور سے ان حالات میں جب کہ ہم میں سے کچھ عاقبت نااندیش افراد اور جماعتوں نے جہاد کے نام پر جارحیت اور دہشت گردی کی راہ اختیار کرکے اسلام کو بدنام کیا ہے، اور دعوتِ اسلامی کی کوششوں کو اور مشکل بنا دیا ہے اور اس کی راہ مسدود کی ہے۔ تاہم ان تمام مسائل اور مشکلات کے علی الرغم ہمیں ایک منضبط راہِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں پوری اُمت مسلمہ اور خصوصیت سے مغربی ممالک کے مسلمانوں کی خدمت میں کچھ گزارشات غور کرنے کے لیے پیش کی جارہی ہیں۔

۱- سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ہمارا اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان ہو اور ہم مسلسل اس کی مدد طلب کرتے رہیں۔ اللہ سے اپنے تعلق کو استوار رکھیں۔ وہ نہایت رحیم و شفیق ہے اور اس کا یہ وعدہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو تمام مشکلات سے نجات دے گا جو اس پر ایمان رکھتے ہیں:

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـــْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ (الانبیاء ۲۱:۸۸) تب ہم نے اس کی (حضرت یونسؑ) کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی اور اس طرح ہم مومنوں کو بچا لیا کرتے ہیں۔

ہمیں اپنے مقصد کا پورا شعور ہو کہ ہمیں اللہ کی بات اس کے بندوں تک پہنچانی ہے اور اس کے لیے ہرممکنہ جدوجہد کریں تو ضرور اللہ کی مدد ہمارے شاملِ حال ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ بھی فرمایا ہے:

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ كَانَ سَعْيُهُمْ

مَّشْكُوْرًا○(بنی اسرائیل ۱۷:۱۹) اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور ہو وہ مومن تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔

۲- ہر انسان کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے خود ہی کی ہے جیسا کہ فرمایا: وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ○ (الحجر ۱۵: ۲۸-۲۹)''جب تمھارے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں ایک بشر پیدا کر رہا ہوں، جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا''، تو پھر ہم کیوں کسی شخص کو اسلام کی نعمت سے محروم رکھیں۔ یہ اُمت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام انسانوں تک جہاں کہیں بھی ہوں اسلام کی دعوت پہنچائے۔ جو بھی ذرائع ہمیں میسر ہیں ہم اپنے دوستوں، رشتہ داروں، ہمسائیوں چاہے قریب ہوں یا دُور، اللہ تعالیٰ کے پیغامِ رحمت و فضل سے محروم نہ رکھیں۔

۳- ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان بدل سکتا ہے۔ برائی کو اچھائی سے بدلا جاسکتا ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (حم السجدہ ۴۱:۳۴) اور اے نبیؐ، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔

ہمیں اپنی تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ کس طرح دشمن، جاںنثار دوست بن گئے۔ تاتاریوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور خلافتِ عباسیہ کا قلع قمع کر دیا تھا لیکن پھر یہی تاتاری ایمان لا کر اسلام کے داعی بن گئے۔ اقبال نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

۴- انسان کو متاثر کرنے کی کنجی اس کے دل میں ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بڑی

حکمت کی بات فرمائی ہے:

دلوں کی کچھ خواہشیں اور میلانات ہوتے ہیں اور کبھی کسی وقت وہ بات سننے کے لیے تیار رہتے ہیں اور کسی وقت تیار نہیں رہتے۔ تو لوگوں کے دلوں میں ان میلانات کے اندر سے داخل ہو اور اس وقت اپنی بات کہو جب وہ سننے کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ دل کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔(کتاب الخراج ،ابو یوسف بحوالہ راہِ عمل، جلیل احسن ندوی، ص ۳۳۲)

یہ اس بات کی تلقین ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ ؕ (النحل ۱۶: ۱۲۵) اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔

۵- بہت کم لوگ کتابیں پڑھ کر اور تقریریں سن کر متاثر ہوتے ہیں۔ عمل اور پاکیزہ اعلیٰ اخلاق کے مظاہر الفاظ سے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم مزاجی اور اعلیٰ اخلاق اور ساتھ ہی طبیعت کی گرم جوشی اور رحم دلانہ برتاؤ تھا جس نے لوگوں کے دل جیت لیے تھے۔ اس بات کی تصدیق خود قرآن نے کی ہے:

فَبِمَا رَحۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَ لَوۡ کُنۡتَ فَظًّا غَلِیۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِکَ (اٰلِ عمرٰن ۳: ۱۵۹) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تُند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردو پیش سے چھٹ جاتے۔

یہ ہمارے آبا و اجداد ہی کے اخلاق تھے جن سے ساحل ملبار (جنوب مغربی ہندستان)، ملایشیا اور انڈونیشیا میں لوگ مسلمان ہوئے۔ وہاں یہ لوگ بطور تاجر گئے تھے اور وہاں جا کر انھوں نے اسلامی تعلیمات کو پھیلا دیا اور ملک کے ملک مسلمان ہوگئے۔ ان ممالک میں مسلمانوں نے کوئی فوج کشی نہیں کی۔ ہمیں غیر مسلموں کے دل جیتنے ہیں۔ انھیں اسلام کی طرف راغب کرنا ہے، اس لیے بین المذاہب مکالمات اور آپس کے تعلقات کو بحال کرنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ ہماری کوشش

کے باوجود ہم بہت سارے لوگوں کو اسلام کے دامن میں نہ لاسکیں۔ تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ ہم بہت سے لوگوں کے دلوں میں اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا کرسکیں۔ اس طرح اگر ہم اپنی دعوت کو عام کرنے کی کوشش کریں تو اللہ سے اُمید ہے کہ یہ نفرت کی فضا جو اسلام کے خلاف پھیلی ہوئی ہے بدل جائے اور اسلام کی صحیح تعلیمات عوام تک پہنچ جائیں اور ہم ان کے دل جیت سکیں۔

۶- تشدد اور جذباتیت کے بجاے اگر ہم حکیمانہ طور سے لوگوں کے دل جیتنے کی کوشش کریں تو اس میں کامیابی ہوسکتی ہے۔ اگر اس طرح کی نعرے بازی کی جائے جو لوگوں کو خوف زدہ کرے تو وہ کیوں ہماری بات سنیں گے۔ لہٰذا بجاے جارحانہ رویے کے اگر ہم حکمت اور دانائی سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرسکیں تو کامیابی ہوسکتی ہے۔ اگر ہم لوگوں کی بھلائی اور ان کے مفاد کے لیے کام کریں تو وہ یقیناً اس کو سراہیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ جس طرح مغرب کے لوگوں کا اسلام اور مسلمانوں کا کلچر سمجھنا ضروری ہے، اسی طرح ہمیں بھی مغرب کی ان اقدار جیسا کہ منصفانہ رویہ، خیرخواہی کا جذبہ، جمہوری طریقۂ کار اور وقت کی پابندی کی قدر کرنی چاہیے۔

۷- مغربی ممالک میں جمہوری طریقۂ کار رائج ہے۔ اقتدار محض مرکزی حکومت کے پاس نہیں ہوتا۔ اپوزیشن پارٹی کے منتخب نمایندے، لوکل کونسلر، میڈیا کے نمایندے، پریشر گروپ اور خود مرکزی اور لوکل گورنمنٹ کی مشینری، ان سب کا اثر حکومت کی پالیسی بنانے میں شامل ہوتا ہے۔ اگر ان اداروں میں بھی ہماری موجودگی ہو یا ان تک ہماری رسائی ہو تو ہم بھی بااثر ہوسکتے ہیں۔

۸- مسلمان بحیثیت مجموعی علم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ علم کے تمام شعبوں میں خاص طور سے سائنس اور ٹکنالوجی میں ہمیں کافی پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم ان علوم میں فوقیت حاصل نہیں کرتے ہم مغرب میں وہ مقام نہیں حاصل کرسکتے کہ دنیا کو درپیش مسائل کا کوئی حل پیش کرسکیں اور اس طرح دنیا کی قیادت کا مقام حاصل کرسکیں۔

مغرب میں اب مسلمان غیر مسلموں کے ہمسایے ہیں۔ وہ یورپ اور امریکا کے کارخانوں، فیکٹریوں، دفتروں، اسکولوں اور کالجوں میں غیرمسلموں کے ساتھ شریک ہیں۔ اس لیے یہ لازمی ہے کہ ان میں باہم اعتماد اور حمیت کی فضا ہو، نہ کہ شک وشبہے کی۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کو اسلام کی دعوت غیرمسلموں تک پہنچانے کے بہترین مواقع حاصل ہیں۔ وہ اپنے کردار اور اخلاق

کے ذریعے لوگوں کو متاثر کرسکتے ہیں۔

ہمیں سوپر پاور سے خوف زدہ اور مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بقول پروفیسر خورشید احمد: ''تاریخ ایک دونہیں بلکہ درجنوں سوپر پاور کا قبرستان ہے''۔ ہم نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا کہ وہ برطانیہ جس کی سلطنت پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا، اس کی یہ شہنشاہیت ختم ہوگئی۔ اسی طرح سوویت یونین جس کا بڑا دبدبہ تھا، شکست و ریخت کا شکار ہوگیا۔ فوکویاما جو *The End of History and The Last Man* (تاریخ کا اختتام اور آخری انسان) کا مصنف ہے اور اس طرح کے اور لوگ جو سمجھتے ہیں کہ امریکا ہمیشہ کے لیے سوپر پاور رہے گا، انھوں نے تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اس کے برعکس نیل فرگوسن جو اگرچہ امپریلزم کا زبردست حامی ہے اور عراق میں جنگ کے حق میں تھا، اس نے اپنی کتاب *Colossus: The Rise and Fall of American Empire* (عظیم الجثہ: امریکی ریاست کا عروج و زوال) میں پیش گوئی کی ہے کہ امریکا اپنی سامراجی قوت کو قائم نہیں رکھ سکے گا اور اس کا خاتمہ اور تباہی کا سبب اس کی داخلی قوتیں ہی ہوں گی۔

اگرچہ موجودہ صورت حال میں ہمارا کام مشکل ہے، لیکن اس میں ہمارے لیے بڑا اجر بھی ہے۔ ہمیں صبروثبات اور حکمت و دانش مندی سے تمام علوم اور ہنر حاصل کرتے ہوئے اللہ کے دین کی دعوت اوروں تک پہنچانا ہے۔ بلاشبہہ اُمت مسلمہ اس وقت نہایت نازک دور اور کڑی آزمایش سے گزر رہی ہے لیکن ہمیں پُرامید رہنا چاہیے۔ اگر ہم اپنے ایمان اور دلی وابستگی کے ساتھ اس راہ پر پوری طرح گامزن رہیں تو ان شاء اللہ اس کی مدد ضرور شاملِ حال ہوگی۔